حالی کی نظم "زمزمۂ قیصری" کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

A Postcolonial Study of Hali's Poem "Zamzama e Qaisari"

[i] حمیرا اکرم [ii] ڈاکٹر محمد عبید اللہ

Abstract:

The establishment and stability of the colonial system in India was not possible by mere political and military power. It was made possible through a long-term cultural and psychological planning. This plan consisted of many tricks, tactics, and policies. In the process, colonizers came across the power of narrative as a treasure. Colonizers used this power of narrative for mental conversion and transformation of the colonized people. Hali has compiled all the narratives of the colonists, which were not visible to the common people of India in his poem titled "Zamzama e Qaisari". Although this poem is a verse translation of an English poem, Hali translated this poem just for the purpose of making narratives of colonial masters, understandable to common people. This translation reflects both foresight and courage of Khawaja Altaf Hussain Hali.

Keywords: *Power of narrative, Colonizer, Colonize, Metanarrative, Psychological conversion.*

ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کا قیام اور استحکام محض سیاسی اور فوجی طاقت سے ممکن نہیں تھا۔ یہ ایک طویل ثقافتی اور نفسیاتی منصوبہ بندی کے ذریعے ممکن ہوا۔ یہ منصوبہ بہت سی چالوں، حربوں اور پالیسیوں پر مشتمل تھا۔ اس عمل میں نوآبادیاتی عوام بیانیہ کی طاقت سے زیرِ بار آئے۔ نوآبادیات نے اس بیانیے کی طاقت کو نوآبادیاتی لوگوں کی ذہنی تبدیلی کے لیے استعمال کیا۔ حالی نے اپنی نظم "زمزمہ قیصری" میں نوآبادیات کی وہ تمام حکایتیں مرتب کیں، جو ہندوستان عوام کو نظر نہیں آتی تھیں۔ اگرچہ یہ نظم ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے، تاہم حالی نے اس نظم کا ترجمہ نوآبادکار آقاؤں کی داستانوں کو عام لوگوں کے لیے قابل فہم بنانے کے لیے کیا۔ یہ ترجمہ خواجہ الطاف حسین حالی کی دور اندیشی اور جرأت دونوں کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: بیانیہ کی طاقت، آباد کار، زیرِ نو آبادکار، نوآبادیات، مہا بیانیہ، نفسیاتی تبدیلی۔

فرانتز فینن اور بعد ازاں ایڈورڈ سعید کی فکر سے جنم لینے والے مابعد نوآبادیاتی مطالعات اپنے تنقیدی پیمانوں اور منفرد تناظرات کی بنا پر نوآبادیاتی عہد کے ادبی متون کے تجزیے کے لیے نہایت معتبر وسیلہ مانے جا رہے ہیں۔ ان تنقیدی نظریات کو مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ افکار و نظریات نے توانائی فراہم کی ہے، جس سے فن پارے کو مزید نئے زاویے سے دیکھنے کے امکانات واضح ہو رہے ہیں۔ مابعد جدیدیت کی فلسفیانہ بصیرتوں سے روشنی حاصل کرنے کے بعد مابعد نوآبادیاتی مطالعات میں، نوآبادیاتی عہد کے تضادات و امتیازات کو جاننے کے علاوہ نوآبادکار کے ہندوستان پر حکمرانی کے جواز، استعماریت کے قیام و استحکام کے لیے کی گئیں کوششوں اور ثقافتی اجارے کے لیے استعمال ہونے والے حربوں اور ہتھکنڈوں کا سراغ لگانے

[i] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین، دبئی محل، بہاول پور۔
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور، بہاول نگر کیمپس(Corresponding Author)

کے سلسلے میں جہاں معروضی اندازِ نظر پیدا ہوا ہے وہاں ان کے تجزیے کے لیے سائنٹفک فکر بھی ادب میں پروان چڑھی ہے۔

برصغیر جیسی عظیم ریاست پر، جس کی آبادی پینتیس کروڑ کے لگ بھگ تھی، اس کو چالیس ہزار بدیسیوں نے جس طرح ذہنی غلام بنایا، وہ سب عسکری طاقت سے ممکن نہ تھا اور نہ ہی جبر اور تشدد کے کسی طویل منصوبے کا نتیجہ تھا، بلکہ ایسا اس وقت ممکن ہو سکتا تھا جب ان کی روحوں میں اتر کر ان کی کیمیائی ترکیب بدل دی جاتی۔ ان کی روحوں تک رسائی ہی وہ قوت بن سکتی تھی جن کے ذریعے وہ ان کے داخلی نظامِ فکر میں بنیادی تبدیلیاں لا سکتے تھے جو ثقافتی اجارہ داری کی راہ ہموار کرنے کے لیے ضروری تھیں۔ نوآبادکار نے اس مقصد کے لیے غالباً مطالعۂ انسانی اور مطالعۂ تاریخ سے استفادہ کرتے ہوئے اس نوع کی تبدیلی کو ممکن بنایا ہوگا، جس کی اہمیت کے بارے میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں :۔

> ''خیالات، تمدن اور تاریخ کو اُس وقت تک سنجیدگی سے نہیں سمجھا جا سکتا یا اُن کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا جب تک اُن کی قوت کو ذہن میں نہ رکھا جائے یا بے کم وکاست اُن کی وضع یا ہیئت کا مطالعہ اور تجزیہ نہ کیا جائے۔''[۱]

اور غالباً انھیں مطالعات کے دوران میں نوآبادکار پر 'بیانیہ' کی اثر انگیزی آشکار ہوئی ہوگی جو نو آبادیات کے اس طویل المیعاد ثقافتی منصوبے کی تکمیل تک کے مختلف مراحل میں دور رس سماجی تبدیلیوں کے کئی حربوں، ہتھکنڈوں اور پالیسوں کی نسبت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ بیانیہ کیا ہے؟ سادہ معنوں میں جب ایک صوتِ حال کسی عمل کے سبب زمانی یا منطقی طور سے دوسری صوتِ حال میں تبدیل ہوتی ہے تو واقعہ وجود میں آتا ہے اور واقعے کے لسانی اظہار یا تنظیم کو بیانیہ کہتے ہیں۔ یعنی کسی واقعے کا ایسا بیان جس میں صورتِ حال میں تبدیلی واقع ہو بیانیہ کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مابعد جدید فکر نے علوم، نظریات، اصطلاحات اور اصناف کی بنیادی ساختوں کو جس طرح منکشف کیا ہے اب ان کے مفہوم میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی ہے، اس تناظر سے بیانیہ میں بھی جو معنوی وسعت پیدا ہوئی ہے اس کے مطابق بیانیہ ایک نظری اور تصوری فریم ورک ہے جو اشیا کو منظّم کرتا، انھیں معرضِ فہم میں لاتا اور

مخصوص قسم کا علم پیدا کرتا ہے۔[۲] علاوہ ازیں بیانیہ تخلیقی قوت کے ساتھ ساتھ ابلاغی قوت کا بھی حامل ہوتا ہے۔ لہٰذا مابعد نوآبادیاتی تناظر سے کہا جاسکتا ہے کہ برطانوی عہد میں بیانیہ نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کا ایسا آلہ اور طاقت کا ہتھیار تھا جو اس وقت نا صرف ایک مخصوص قسم کا علم پیدا کر رہا تھا بلکہ ثقافتی اجارے کی راہ ہموار کرنے کی غرض سے مقامی باشندوں کی ذہن سازی بھی کر رہا تھا۔ نوآبادیاتی بیانیہ ٹھوس شواہد پر مشتمل معروضی حقائق کا بیان نہیں تھا اور نہ ہی یہ عقلی و تجزیاتی علم تھا بلکہ نوآبادیاتی مقاصد کے تحت یہ مخصوص علم دینے یا ذہن سازی کرنے کے لیے ایک خود ساختہ واقعے کا منظّم لیکن غیر تجزیاتی بیان ہوتا تھا۔ اس کی تشکیل یا دریافت کیسے ہوئی؟ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ”نوآبادیاتی نظام کسی داخلی دباؤ کے تحت بیانیے کی قوت دریافت کرتا ہے۔ طاقت کی مختلف شکلوں کی دریافت و تشکیل کے دوران میں بیانیہ، قوت کے عظیم مخزن کے طور پر اس کے ہاتھ لگتا ہے۔ اس سلسلے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے، مگر یہ بات غیر مشتبہ ہے کہ بیانیے کو نوآبادیاتی طرزِ حکمرانی میں ایک بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔“[۳]

اس عہد کے بیانیوں سے اور ان کی طاقت سے اس وقت کے دانش ور اور ادیب کس حد تک واقف تھے، اس کا اندازہ اس عہد کے اہم ادیب اور دانش ور حالی کی مترجمہ نظم 'زمزمۂ قیصری' کے مابعد نوآبادیاتی مطالعے سے لگائیں گے۔

حالی نے اُس عہد میں آنکھ کھولی جب مسلمان دانش وروں اور علما کے سامنے دو راستے تھے۔ مراجعت کا یا آگے بڑھنے کا۔ اِن دونوں کے سنگم پر کھڑے یہ لوگ عجیب ذہنی اذیت اور مخمصے کا شکار تھے:

> ”اِن پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی تھی، اپنے اپنے آثار الصنادید کو اپنے اپنے دل میں زندہ رکھنا بھی اور ایک نئے معاشرے کی تعمیر بھی، سو اِس نسل نے یہ ذمہ داری پوری طرح نبھائی اور شاید اِس ذمہ داری کے نبھانے کے عمل میں وہ نوآبادکاروں کے ہاتھ میں اُن کے سیاسی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے آلہ کار بھی بنے۔“[۴]

یہ تاریخ کا جبر تھا جو اُس عہد کے دانش وروں کے فن پاروں کو تکثیریت کی حامل بناتا اور معنی کی کئی جہات عطا کرتا ہے۔ وقت کے جبر سے بعض اوقات کیسے کیسے تضادات پیدا ہوتے ہیں۔

میرے ظاہر کو بھلا کر کبھی باطن کو پرکھ ایک زخموں سے اٹی روح دکھائی دے گی
میں ہنسوں گا تو تجھے میری ہنسی کے پیچھے کسی سسکی کی صدا صاف سنائی دے گی[۵]

اس وقت بھی یہی نوآبادیاتی جبر تھا جو حالؔی کے قلم سے غاصبوں کے قصیدے لکھوا رہا تھا اور ظالموں کے مرثیے بھی، سیاسی جبر کے موسم میں امن کے گیت بھی اور استحصالی عہد میں آزادیٔ رائے کے ترانے بھی، نوآبادیاتی مقاصد کے لیے کہیں ادبی اصلاحات کروا رہا تھا تو کہیں صدیوں پرانی تہذیبی روایات سے گریز بھی۔ اِن تمام امور کی بجاآوری کے دوران میں حالؔی کے قلم نے بہت مرتبہ جبر کو تسلیم کیا لیکن حالؔی کی فکر اور اُن کی روح جو ہند اسلامی تہذیب کی پروردہ تھی، جن کی شخصیت کے خمیر میں یہ اسلامی تہذیبی افکار رچ بس گئے تھے، انھوں نے کہیں بھی اِس جبر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ قلم اور فکر کی یہ ثنویت، ارتباطِ حرف و معنی کی صورت میں ان کی ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ 'زمزمۂ قیصری' میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ مسٹر ایسٹوک کی اس نظم کا ترجمہ حالؔی نے ۱۸۷۸ء میں کیا جو کمشنر دہلی کرنل ڈیوس کے توسط سے ان تک پہنچی تھی۔ اس انگریزی نظم کے تین حصے تھے۔ پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذکر تھا جب کہ دوسرے اور تیسرے حصے میں دربارِ قیصری میں شریک رئیسوں کا ذکر تھا۔ حالؔی نے صرف پہلے حصے کا اردو ترجمہ کیا تھا کہ کمشنر دہلی نے باقی دو حصوں کا ترجمہ فارسی میں نظم کرنے کو کہا لیکن حالؔی نے بہ سبب علالت معذرت کر لی۔ یہ نظم ۳۵ پینتیس بندوں پر مشتمل ہے اور اِس کے ہر بند میں چھے، چھے اشعار ہیں۔ اس نظم میں نوآبادکار کے خیالات کے حوالے سے حالؔی خود لکھتے ہیں کہ:۔

> ''مصنف نے پہلے حصے میں بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ناظرین اس کو دیکھ کر مجھ سے خوش یا ناراض نہ ہوں۔ میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں نے ان خیالات کو ایک ایسی زبان میں نظم کیا ہے جس کو میرے ہم وطن سمجھ سکتے ہیں۔''[۶]

یعنی حالؔی کو خود احساس تھا کہ اس نظم میں بیان کردہ وہ افکار جو مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی سے متعلق ہیں، قابل اعتراض ہو سکتے۔ اس کے باوجود انھوں نے اس کو تحریر کیا، اگرچہ بہ سبب علالت وہ اس کے اُردو ترجمہ کرنے سے بھی انکار کر سکتے تھے۔ تو آخر کیا وجہ تھی جس نے ناظرین کے متوقع ردعمل کے باوجود حالؔی کو لکھنے پر مجبور کیا؟ اس کی پہلی وجہ تو حالؔی کے اس اعتراف میں ملتی ہے کہ وہ ان خیالات کو ایسی

زبان میں نظم کرنا چاہتے تھے کہ جس کو مقامی ہم وطن سمجھ سکیں۔ اور وہ کیا ایسے ضروری خیالات تھے جو حالیؔ سمجھانا چاہتے تھے، جس کی خاطر انھوں نے اسے ترجمہ کیا تاکہ ان کے ہم وطن ان کو سمجھ جائیں۔ وہ دوسری وجہ اس نظم کی قرات کے دوران میں آشکار ہوتی چلی جاتی ہے، اور وہ ہے نوآبادکار کے ان تمام بیانیوں کو آشکار کرنا، جن کے نفسیاتی اثرات نے اُن کے ثقافتی منصوبوں کو ممکن اور آسان بنایا۔

نظم کی ابتدا ہندوستان کی سرزمین کو "اے حصارِ عافیت" کا لقب دیتے ہوئے ہوتی ہے جس میں اس سرزمین کی جغرافیائی خوب صورتی اور فطری حُسن کے بیان کے بعد کہتے ہیں۔ ؛دو مصرعے دیکھیں :

خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ ہے اندر کا فکر [۷]

اور یہ کہ :

چل رہی ہے امن کی ہر سُو ہوائے خوشگوار [۸]

تو یہاں اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی یہ صوتِ حال ایک نظری فریم ورک کے تحت بیان کی جا رہی ہے، تاکہ اس کے بعد زمانی یا منطقی طور سے دوسری صوتِ حال میں تبدیل ہونے کے واقعے کے درمیان میں اپنے مخصوص علم پیدا کرنے والے بیانیے کو لایا جاسکے۔ لہٰذا ہندوستان کی ایسی فراغت اور امن وامان کی صورتِ حال کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں "اے مقدس آریہ ورتھ !" تجھ پر ایسی کیا بلا آئی کہ جس نے تیری بزم کو برہم کر دیا۔ اگرچہ تیری فوج کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے دشمنوں کے ہوش اُڑ جاتے۔ وہ یا تو بھاگ اُٹھتے یا پھر تیری اطاعت کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے اندر اتفاق اور اتحاد رخصت ہو گئے ورنہ کسی کو تیری طرف آنکھ اُٹھانے کی ہمت بھی نہ ہوتی، حقیقت میں یہی بیانیہ ہے؛ کہتے ہیں :

تو کہاں اور اہلِ مغرب کے بھلا حملے کہاں — ہاں مگر نہ اتفاقی کی ملی تجھ کو سزا
گر تیری اولاد میں ہوتا سلوک اور آشتی — لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگام وغا [۹]

درج بالا دو بندوں میں سے پہلے بند میں ہندوستان کو ایسا ملک قرار دیا جا رہا ہے کہ جس کو اب کسی اندرونی، بیرونی دشمن کا خوف نہیں، تو یہ وہ نفسیاتی حربہ ہے جو کسی بھی ایسے اجنبی شخص کے لیے خلوص اور محبت پیدا کر سکتا ہے جو انسان کے وطن اور اس کی سرزمین کو بہت اچھا کہے۔ مقامی لوگوں کی حب الوطنی کے جذبات کو متحرک کرکے نوآبادکار اپنے لیے انسیت کا ایک خاص جذبہ پیدا کرتا اور پھر وہ ڈرامائی انداز میں

یہ بیانیہ دیتا ہے کہ اہلِ مغرب کے حملوں کی کیا حیثیت تھی ہندوستان کی وسعت اور طاقت کے مقابلے میں، لیکن ابنائے گیتی کی نااتفاقی نے یہ ممکن کر دکھایا۔ یہاں سرزمینِ ہندوستان کی طاقت اور اس کی وسعت کو بڑھا چڑھا کر سامنے لانے کا مقصد اس کی تعریف کی آڑ میں مقامی نااتفاقی کو بڑا عنصر بنا کر پیش کرنا ہے کہ جس کی بنا پر مغرب کے لیے حملہ کرنا آسان ہوا۔ یوں اس توجیہہ میں نوآبادکار کی یہاں کے اقتدار کو ہتھیانے کے لیے کی گئیں ہر قسم کی عہد شکنیاں، عیاریاں، مکاریاں اور چالبازیاں بھی کیموفلاج ہو جاتی ہیں۔

ناصر عباس نیّر کے مطابق نوآبادیاتی عہد میں بیانیے کی تھیوری نہ پہلے سے موجود ہوتی ہے اور نہ اِس کی تشکیل کی جاتی ہے بلکہ ثقافتی اور نفسیاتی تبدیلیوں کے لیے بیانیے کو ایک عظیم وسیلے کے طور پر برتا جاتا ہے۔ یوں استعماری عہد میں استعمال ہونے والے نوآبادیاتی حربوں میں سے 'بیانیہ' ایک کامیاب ترین حربے کے طور پر سامنے آتا ہے، جسے دور رس سماجی تبدیلیوں کی خاطر وضع کیا جاتا ہے۔ بیانیہ روزمرہ زندگی کا حصہ ہونے، غیر تجزیاتی علم ہونے اور عمومی و عوامی ہونے کی بنا پر یہ عقلی علم سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتا۔ زمزمہؔ قیصری میں روئیداد اور بیانیے کے امتزاج سے نظم کی تعمیر ایک حکمتِ عملی کے تحت ہوتی ہے۔ چناں چہ اگلے بند میں نہایت ہمدردی اور تاسّف کے ساتھ ہندوستان میں مہر والفت کی کمی، ہمدردی کے فقدان اور کینہ پروری کے رجحانات کا ذکر کرنے کے بعد، مقامی سطح پر پنہاں درندے اور اندرونی دشمن یا غداروں کی موجودگی کو نہایت چونکا دینے والے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

سر بسر تختے تھے گل خود رو کے جس جنگل میں تھے
غور سے دیکھا تو پنہاں تھے درندے بھی وہیں [۱۰]

یعنی اس معاشرے کی تباہی کے ذمہ دار یہاں کے مخصوص رویے اور اعمال تھے نہ کہ برطانوی سامراج۔ یہ تھا وہ مخصوص علم جو بیانیوں کے ذریعے نوآبادکار یہاں کے ذہنوں پر نقش کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد آریائی قوم کو جنگ اور خوں ریزی کی رہنما ثابت کرنے اور درج بالا وجوہ کی بنا پر ہندوستان میں تزلزل پڑنے کا ذکر اس نظم میں مقامی لوگوں کی پوری توجہ کو نوآبادکاروں کے عزائم اور مقاصد سے ہٹانے کے لیے کامیاب حکمتِ عملی کے مظہر کے طور پر ابھرتا ہے۔

چوتھے اور پانچویں بند میں سکندرِ اعظم جیسے "کشور کشائے نامور" کے حملے اور فتح اور چھٹے باب میں یونان کے سوتیر خاندان کے مشہور بادشاہ مینینڈر اور بعد ازاں "ستھیاوالے" کے حملوں اور ایک دوسرے کو مار بھگانے کا ذکر ہے۔ ہندوستان پر مختلف اوقات میں مختلف حملہ آوروں اور ان کی فتوحات اور ایک دوسرے کے مار بھگانے کی ایک تاریخ مرتب کرتے ہوئے جب مسلمان حملہ آور کا ذکر آتا ہے تو نوآبادیاتی بیانیے کا انداز کیا ہو جاتا ہے:

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند — جانبِ ہندوستاں محمود نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابرِ رحمت تھا مگر — ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند"

دوسرا شعر صدیوں سے اکٹھے رہتے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کی نیت سے گھڑا گیا وہ بیانیہ ہے جس کی انتہا دونوں قوموں کے دو علیحدہ اوطان کے حصول پر منتج ہوئی۔ اس کے بعد اس مسلم حملہ آور کا ذکر یوں آتا ہے:

وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی واں آفت بپا — اور چلتا تھا جلو میں اس کے آسیب و گزند
غش پہ غش آتے تھے ہر ذی روح کو پیہم وہاں — سانس لیتا تھا جہاں وہ اژدہائے زور مند
روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری — صلح سے بجھتا نہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند[۱۲]

محمود غزنوی کے لیے اتنے سخت الفاظ کے حوالے سے حاشیے میں حالی لکھتے ہیں:

"انگریزی مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور افروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے تھے۔ جس طرح اس بند میں محمود کی بے رحمی اور ظلم کا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ایک انگریز نے اس کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے:

ٹھاکر اور ان کے مندر، راجا اور ان کے تخت — پتلا غضب کا کون سا وہ ہولناک ہے؟
کتے جو اس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار — کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
حملے سے اس کے آ کے پڑا سب پہ وقت سخت — اے ملک زرنگار وہ غزنی کی خاک ہے
ان کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار — اور بے گناہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ[۱۳]

ان اشعار میں بھی ایک مسلمان حملہ آور کے دیگر مظالم کے ساتھ 'بے گناہ پجاریوں' کا قتل وہ بھی 'مندروں کے بیچ' ایسا جذباتی اور ہیجان پیدا کرنے والا خوفناک بیانیہ ہے جو مذہب کو ہندو مسلم تقسیم کے لیے خطرناک آلہ کار بنانے کی ابتدا کرتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف پھیلائی جانے والی یہ نفرت کئی مقاصد اپنے جلو میں لیے ہوئے تھی:

جب وہ آیا تھا تو سر تا پا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یاں سے تو مثلِ دشتِ ویراں تھا یہ ملک [۱۴]

مسلمانوں کے خلاف یہ وہ بیانیے ہیں جو نوآبادکار نے یہاں کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف گھڑے تھے۔ ناصر عباس نیّر کے مطابق استعماری بیانیے ایک خاص طرح تشکیل دیئے جاتے کہ وہ دیکھنے اور سننے میں خوش نما، ترغیب آمیز، ناگزیر مگر حقیقت میں غلبہ پسند ہوتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ ان بیانیوں کی غلبہ پسندی مخفی ہے رہتی، جس کی وجہ سے ان کے استعماری ہونے کا تاثر نہیں ملتا تھا بلکہ وہ حالت سدھارنے کے لیے اس قدر دلفریب اور ناگزیر محسوس ہوتے کہ ان پر سوال اٹھانا تو درکنار، ان کو فوراً ہی قبول کر لیا جاتا ہے۔ استعماری بیانیوں کی شعریات کے التباسی اور تزویری ہونے کے ثبوت کے لیے وہ نوآبادیاتی عہد کا بیانیہ 'ہم ہندوستان کو مہذب بنانے آئے ہیں' کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

"۔۔۔ تہذیب آموزی (Civilizing mission) انیسویں صدی کے نوآبادیاتی ہندوستان کا معروف بیانیہ تھا (باقی بیانیے اسی سے ماخوذ یا اس پر منحصر تھے) دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بیانیہ فرانسیسی الاصل تھا۔ فرانسیسی ترکیب mission civilization سے ماخوذ تھا۔ فرانسیسی میں تہذیب سیکھنے سے مراد جبر سے آزادی تھا۔ جیسے عناصر کا آدمی پر جبر، بیماری کا صحت پر، جبلت کا عقل پر، جہالت کا علم پر اور ملوکیت کا آزادی پر جبر۔ دیکھنے میں یہ کس قدر خوشنما ہے، یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ کون ہے جو عناصر، بیماری، جبلت، جہالت اور آمریت کے جبر سے آزادی نہیں چاہتا؟" [۱۵]

اب اسی تناظر میں عمومی فکر کو متجسس کرتے سوال اور پھر عیارانہ انداز میں خود ہی جواب دیتے یہ اشعار دیکھیے:

آخر اے دانا حکیمو! کچھ سبب اس کا بتاؤ؟ جب کہ حق اور راستی ہے خاص رحمانی صفت
جب کہ ہے سرچشمۂ مہر و محبت ذاتِ حق ہے بنی آدم کو کیوں قتل بنی آدم کا چاؤ؟
پھر تعجب ہے کہ جباری کا ہو اس میں لگاؤ پھر نہ مانی جائے کیوں اس کی شریعت بے دباؤ[16]

ان تمام باتوں کے بعد نوآبادکار کا بیانیہ یوں ظاہر ہوتا ہے:۔

کیا یہ زیبا ہے کہ دینِ حق کو اے ابنائے جنس
زور سے منواؤ تم اور ندیاں خوں کی بہاؤ[17]

یہ ایک اور 'بیانیہ' ہے جسے نوآبادکار اس وقت بڑے زور و شور سے پھیلا رہا تھا کہ؛ 'اسلام تلوار اور طاقت کے زور پر پھیلا'۔ یہی بیانیہ اسلام کی ساری دعوتِ حق کی پر امن انسان دوستی کی تاریخ جو مسلمان صوفیہ کی رواداری، خلوصِ نیت، جذبۂ ہمدردی اور خدمت گزاری سے عبارت ہے؛ اس کو یک قلم ختم کرنے والا تھا۔ اور پھر یہاں سے وہ نقب لگا کر خود کو مہذب اور امن پسند ظاہر کرنے کا بیانیہ یوں لاتا ہے:۔

راہِ حق کا خار و خس سے پاک ہونا چاہیے
گلشنِ دیں بے خس و خاشاک ہونا چاہیے[18]

یعنی نوآبادکار انتہائی مہذبانہ انداز میں ایک ایسے اصلاحی مقصد کے تحت اپنا ایک نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے جس کو وہ آئیڈیالوجیکل طریقے سے خود وضع کر رہا ہے؛ کہ لوگوں سے محبت، دوستی اور یگانگت پیدا کرو؛ ان کے دل تسخیر کرو اور پھر دین کی تبلیغ کرو اور دین کا یقین دلاؤ۔ خود کو مہذب اور امن و امان کا علمبردار منوانے کے ساتھ یہیں سے نوآبادکار White man's burden کے حوالے سے آئندہ کے لیے بنیاد بھی فراہم کر رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام پھیلا ہی صوفیائے کرام کے پُرخلوص طرزِ عمل، رواداری، حسنِ سلوک اور دلوں کو تسخیر کرنے کے عمل سے ہے۔ نوآبادکار اِن بیانیوں سے اپنے ایک اعلیٰ اقدار اور نظریات کے حامل ہونے کا تصور راسخ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسی تسلسل میں جب آگے کہتے ہیں کہ:

خار ہی خار آتے ہیں مدت سے لیکن یاں نظر
خون سے اُستاد اور شاگرد دونوں کا ہَدَر[19]

تو اس کا مقصد اپنے تصورِ امن و امان کے پسِ پردہ مسلمانوں کے فلسفۂ جہاد کو متنازع بنانا اور

غیر فطری اور ظالمانہ طرزِ عمل ثابت کرنا بھی تھا۔ بیانیے چونکہ ہماری روزمرہ زندگی کے تجربوں، ارادوں اور خوابوں کی آمیزش سے ترتیب پاتے ہیں اِس لیے ہم اِن کو بغیر کسی ردو کد کے قبول کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف بیانیہ طرزِ فکر، عمومی واقعاتی، غیر رسمی اور روزمرہ ہوتی ہے۔ اسی بنا پر یہ زندگی پر زیادہ شدت اور کثرت سے اثر انداز ہوتے ہے۔ اور تیسرا یہ کہ استعماری عہد کے بیانیے ایک خاص مقصد کے لیے وضع کیے جاتے تھے تو ان کا اثر سست الاثر زہر کا سا کام کرتا تھا۔ آگے آنے والے اشعار استاد اور شاگرد دونوں کے تعلیم کے ذکر سے اسلامی روایات اور اقدار کو بے فائدہ اور مہمل ثابت کرنے اور حصولِ علم کے لیے سختی سہنے کے عوامل کے حوالے سے دونوں کی محنت پر پانی پھیرتے اور ان کی مشقت کو پل بھر میں بے سود قرار دیتے ہیں۔ دوسرا اِن کا مقصد علامتی انداز میں جہاد کی ترغیب اور جہاد کے عمل کو متنازع بنانا تھا، اس کے ساتھ ہی کسی مقصد کے لیے کی جانے والی کوشش سے بیزار کرنا بھی تھا۔ بظاہر خوشنما دکھائی دینے والے یہ تہذیب آموز بیانیے جتنے گمراہ کن تھے، آج دنیا میں ہر شعبے میں پیچھے رہ جانے والی قوم کی حیثیت سے ہم ان کو بھگت رہے ہیں۔

نوآبادیاتی حکمران زمان اور تاریخ سے مکمل آگاہ رہے۔ تمام نوآبادیاتی نظام ثقافتی اور معاشی ایجنڈے، زمان اور تاریخ پر حصولِ دسترس اور اُن کی نئی تشکیل کرنے سے عبارت ہے۔ یہی وہ سیاق ہے جس میں نوآبادکار، بیانیے کی اثر انگیزی اور طاقت سے متاثر ہوا۔ نوآبادیاتی بیانیے میں ایک ایسا حال تخلیق کیا جاتا جس میں ماضی اور مستقبل بیک وقت موجود ہوتے۔ اِسی بنا پر بیانیہ ہر بات کو مکمل بناتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کی نئی تشکیل کرتے ہوئے نوآبادکار نے مقامی باشندوں کے اسلاف اور اکابرین کے کردار جس انداز میں مسخ کیے اس حربے کی ایک جھلک جلال الدین اکبر کی تعریف ہے۔ پہلے ماضی اور مستقبل کے حوالے سے تعریف کر کے مقامی لوگوں کے دل میں اپنے لیے ایک نرم گوشہ پیدا کرتے ہیں:

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہِ نام دار
صلح کل جس کی زمانے میں رہے گی یادگار[۲۰]

اس کے بعد جلال الدین اکبر کے دورِ حکومت میں آزادیٔ رائے کی تعریف کے بعد جو بیانیہ سامنے

آتا ہے، اس میں اصل فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے جس کا مقصد مقامی باشندوں میں شخصیت کا بحران پیدا کرنا اور ان کے اسلاف سے انھیں بدگماں کرنا تھا۔ گزشتہ کی تعریف اور حال کی تنقیص، اس طرزِ عمل میں بڑی حکمت تھی، پہلے بیان کردہ تعریف سے اپنے خلوص کا یقین دلا کر، تنقیص کے ردعمل یا اس کے منفی اثرات سے محفوظ رہنا تھا۔ نوآبادکار جس بات کی تعریف کرتا اس کے مثبت اثرات اس قدر زیادہ نہ ہوتے جتنے اس تعریف کی آڑ میں برائی بیان کرنے کے اثرات منفی ہوتے۔ حقیقت یہ تھی کہ قوم سے منسوب کسی شے، ان کے ماضی اور ان کی تاریخ یا ان کے کسی ثقافتی مظہر کی پہلے عظمت بیان کرنے کے بعد پھر اسی سے متعلقہ موجودہ روایت یا اس کے تسلسل کو ناقص اور زائد المعیاد قرار دینے کا بنیادی مقصد ان کو حاضر و موجود سے بیزار کرکے ان کی شخصیت کو مسخ کرنا تھا۔ اسی تسلسل میں لکھتے ہیں:

پر تری اولاد نے کی پیروی تیری نہ حیف ہو گیا ان کا تعصب خود گلے کا اُن کے ہار
ثمرہ آخر مل گیا اُن کے تعصب کا اُنہیں کر گیا رحلت جہاں سے جلد اُن کا اقتدار[۲۱]

اکبر کے جانشینوں کی برائی اور ان کی بربادی کی وجہ تعصّب کو قرار دیا گیا ہے۔ مغل بادشاہوں میں دیگر بشری خامیوں سے قطعِ نظر، ان حکمرانوں میں لسانی یا مذہبی کسی قسم کا تعصب نہ تھا جب کہ اِس کے برعکس انگریز خود نسل اور قومیت کے اعتبار سے شدید متعصب تھا۔ اس حوالے سے ششی تھرور کا بیان بہت اہم ہے:

"۔۔۔برطانویوں نے ہندوستا کو نوآبادیاتی دو کے ان تعصّبات سے بھر دیا جو کہ وہ اپنے وطن میں عرصۂ دراز سے ترک کر چکے تھے لیکن جس کی لکیریں ہندوستان میں کھینچی گئیں، جو لاکھوں لوگوں کے لیے ان کہی بدحالی کا باعث بنیں۔"[۲۲]

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے قبل وہ معاشرہ ایسے تعصّبات سے پاک تھا جو فتنہ و فساد کا سبب ہوں، چونکہ کسی بیانیے کی طاقت اس میں چھپے حقائق کے مستند یا غیر مستند ہونے پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ بیانیہ اپنے کہنے والے کے اعتماد اور زورِ بیان کے ستونوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں نوآبادکار شاطر اور گھاگ سیاست دان کی طرح نہایت بلند آہنگ سے اپنے اعلیٰ اخلاقی معیار کے ذکر کے پس پردہ، مقامی لوگوں کو اخلاقی طور پر گرا ہوا ثابت کرنے اور اپنی عظمت جتانے کی کوشش کرتا ہے۔ نوآبادکاروں کے یہ حاوی بیانیے اپنی

خطابت، اپنی گھن گرج، اپنی علمیات اور ترسیل کے وسائل پر اجارے سے انھیں جو اعتماد بخشے ہوئے تھے، حالؔی نوآبادکار کی اسی اعتماد کے تحت اس کی فکر کو یوں ظاہر کرتے ہیں:

کیا مرہٹے، کیا مغل، سادات کیا افغان کیا — عہد میں سب کے رہی یاں بارشِ ابرِ بلا
علم، فن، جرات، نکوئی، مٹ گئیں سب خوبیاں — دم بہ دم طوفاں بدی اور عیب کا بڑھتا رہا[۲۳]

اس کے بعد یہاں کی ظلمت و تاریکی، مایوسی اور بد حالی کا ذکر، نوآبادکار کے یہاں آنے اور اقتدار سنبھالنے کے جواز کو جائز اور استحکام بخشنے کے طور پر آتا ہے۔ یہ تمام بیان کردہ تشکیلی منظر نامہ مقامی باشندوں کی ذہن سازی کرنے کے لیے بیانیوں کے زور پر حقیقی ثابت کیا گیا۔ پھر ایسے ظالم معاشرے میں نوآبادکار کی آمد جس طرح ایک فلمی دبنگ ہیرو کے طور پر ہوتی ہے اس کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

ڈوبتے کے جب نظر آنے لگے آثار سے — تب نجات آئی یہاں ساتوں سمندر پار سے
آ کے انگلستان نے طوفاں کو للکارا کہ بس — باز رہ اے فتنہ، اپنی گرمیٔ رفتار سے[۲۴]

خود کو ہندوستان کی تباہ حالی کے اس عہد میں ڈرامائی انداز میں ایک ہیرو، ایک رہبر اور ایک مخلص رہنما کے طور پر پیش کرنے کے بعد اگلا بیانیہ ان نسلی متعصب نوآبادکاروں کا مزید چونکا دینے والا ہے:

مدتوں کی سختیوں سے ملک چھوٹا یک قلم
ہند کو اپنوں نے دی آکر نجات اغیار سے[۲۵]

یہاں نوآبادکار کی عیارانہ سوچ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلے وہ اپنی آمد سے قبل کے عہد کو سختیوں کا حامل اور پھر اغیار یعنی مسلمانوں کو غاصب اور خود کو 'اپنا' ثابت کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال کہ وہ ہندوؤں کے اپنے کیسے ہو سکتے ہیں؟ چناچہ تقاضائے وقت کے پیشِ نظر انھیں اپنا نسلی تفاخر بھلا کر ہندوستانیوں سے نسلی اشتراک پیدا کرنا پڑا۔ مقصد کے تحت اپنے نسلی تفاخر کو قربان کرتے ہوئے یہ بیانیہ گھڑتے ہیں:

اہلِ ہند اور اہلِ مغرب اصل میں سب ایک ہیں — کچھ دنوں بچھڑے رہے پر گردشِ ادوار سے
گو رہے چندے جدا پر مل گئے انجام کو — کلفتیں بدلی گئیں فرقت کی آخر پیار سے[۲۶]

بیانیے کا صحیح استعمال ہی اثر پذیری کا ضامن ہوتا ہے اور اس فن میں نوآبادکار نے مہارت حاصل

کر لی تھی۔ دراصل نوآبادکار ہندوستان پر اپنے اقتدار کے لیے قانونی اور اخلاقی جواز ڈھونڈ رہے تھے جو ہر طبقے خصوصاً اشرافیہ کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے اقتدار کے جواز کے لیے ہر ہر سطح پر پائی جانے والی معاشرتی کجیوں، سیاسی کمیوں اور اخلاقی خرابیوں کو منظّم کرکے، قابلِ فہم بیانیوں کی تکنیک میں یوں اجاگر کیا کہ مقامی باشندے ان کی غلبہ پسندی کے مخفی عزائم کو جان ہی نہ پائے اور احساسِ کمتری کا شکار ہوتے چلے گئے۔ حالات و واقعات کو ان کے سیاق سے کاٹ کر ایک قطعی غیر منطقی صورتِ حال کو جس قدر منطقی اور استدلالی انداز سے بیان کرنے کا فن نوآبادکار کو حاصل تھا اس کی مثال کے لیے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہند میں پہلے کبھی جو سلطنت یک سو نہ تھی — اس کو امرِ اتفاقی جاننا ہے ابلہی
یہ بھی کہنا غیر ممکن ہے کہ تھی اسلاف میں — تجربے کی، عقل کی، تدبیر و جرات کی کمی
ہاں مگر تقدیر پر ہے جب کہ ہر شے کامدار — چاہیے کہنا کہ تقدیرِ الٰہی تھی یہی
اکبر اور شاہِ جہاں کی ذات میں کیا کچھ نہ تھا — سلطنت کی جو لیاقت چاہیے وہ ان میں تھی[۲۷]

یہاں 'ذات میں کیا کچھ نہ تھا' تعریف کی بجائے ان کی ایسی بشری خامیوں کی طرف اشارہ ہے جو چھپانے کی نسبت سے بہت زیادہ ثابت کی جا رہی ہیں۔ یہ خامیاں اس بند کے دیگر اشعار سے خود واضح ہو جاتی ہیں کہ ان کے عہد میں افتراق و تفریق اپنے عروج پر تھی۔

نوآبادکار نے ہندوستان پر اپنی حکومت کے جواز کو استحکام بخشنے کے لیے جو بیانیے وضع کیے اس کا ذکر بھی اس نظم میں ملتا ہے۔ اگلے بند حالی نوآبادکار کے کیے گئے سوال پوچھتے ہیں کہ کیا ضرورت ہے کہ نوآبادکار ہندوستان پر مختار اور قابض رہے۔ اور جواباً یہ کہا کہ اگر کوئی ایسا سوال کرے تو اس کو بتانا کہ جس مملکت کے حصول کے لیے اس قوم کے لوگوں نے خوں بہایا، جنگیں لڑیں تو:

مفت اسے ہاتھوں سے کھو دینا، روا ہو کس طرح؟
خوں بہا ان سورماؤں کا ادا ہو کس طرح؟[۲۸]

اسی تسلسل میں جب وہ منطقی اور استدلالی انداز میں کسی کو اس سوال پر مطمئن نہیں کر سکتا تو یہاں پینترا بدلتے ہوئے بڑی نفسیاتی چال چلتا ہے۔ یہاں وہ انگلستان کی عظمت، اپنے حکومت کرنے کے جواز اور مقامی باشندے کو مشرقی انسان کی وضع کردہ اساطیری تصویر کی مانند جانور قرار دینے کے تینوں بیانیوں کو

اکٹھے سمو دیا ہے:۔

بحث کرنی اس سے لاحاصل ہے، سمجھا دو اسے ناحق ایسے شخص کے کہنے کا تم مانو بُرا
ننگِ ذلت ہے نہ کچھ پروائے عزت ہے جسے تجھ کو انگلستان کی شہرت سے کچھ نسبت نہیں
جس کی فطرت میں کہ حیوانوں سے کم خست نہیں ہر مذلّت اور پستی پر قناعت ہے جسے[۲۹]

درج بالا تین شعر آج زمانی بُعد سے اس صورتِ حال کو واضح کر سکتے ہیں کہ ایک ظالم، شاطر اور بااختیار حاکم اور دوسری طرف مظلوم، سادہ اور بے بس غلام، کے مابین مکالمہ ایسے ہی ہو سکتا ہے۔ اونچی مسند سے بولا گیا ظالم کا جھوٹ، مظلوم بے بس کے سارے سچ کے ثبوتوں پر حاوی ہوتا۔ یہ صرف نوآبادیاتی ملکوں کا نصیب چلا آ رہا ہے۔ ظالم اب بھی اپنے ظلم کے جواز میں لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے نہیں بلکہ انھیں ان کی اوقات کا احساس دلانے کے لیے بے بنیاد دلیل، بے تکی منطق اور بے ڈھنگے عذر تراش کر ایسے ان کو خاموش کراتا ہے کہ وہ مزید تذلیل کے احساس سے سر نہیں اٹھا سکتے۔ اُس عہد کے بیانیے بھی ایسے ہی تھے۔ دوسرا یہ کہ نوآبادیاتی عہد کے بیانیے چونکہ ایک نظری فریم ورک کے تحت تشکیل کردہ ہوتے ہیں لہٰذا اکثر ان میں داخلی تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سوال اُٹھانے والے کو حقارت سے خاموش کرا دینے کے اس رویے کو اگر پیشِ نظر رکھیں تو اسی نظم میں جب نوآبادکار اپنے دورِ حکمرانی کی فضیلت یہ کہہ کر بیان کرتا ہے کہ:

اتفاق اور دوستی نے کر دیا ہے سب کو ایک
اور آزادی نے کر رکھا ہے ہر اِک کو جدا[۳۰]

تو اس آزادی یعنی آزادیٔ رائے کی حقیقت کی قلعی بھی کھل جاتی ہے۔

مغربی استعمار کاروں نے یورپین اقوام کی جرات، بہادری اور جنگجوئی جس طرح اہلِ ہندوستان سے منوائی اس کی حقیقت بھی اس نظم سے کھلتی ہے کہ کس طرح دہلی کی تباہی کو اپنی فتح قرار دے کر اس تباہی کے دکھ کو مقامی لوگوں کے احساسِ کمتری میں بدلنے کے لیے نوآبادکار نے بلند آہنگ انداز سے ایسے بیانیے گھڑے، جنھوں نے بہت حد تک مقامی لوگوں کے ذہنوں پر یورپین اقوام کی بہادری راسخ کر دی۔ 'زمزمۂ قیصری' کا منظوم ترجمہ حالی نے اس کو بھی ترجمہ کر کے عام لوگوں تک پہنچانے کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ نوآبادیاتی نظام کی پوری عمارت ہی 'لڑاؤاور حکومت کرو' کی پالیسی پر استوار ہوئی اور اس نظام کے قیام کا دار ومدار بھی اسی اصول پر تھا، لیکن کیسی حیران کن بات ہے کہ یہاں نوآبادکار یہ کہہ رہا ہے:

قوت اور امن و خوشی میں ثمرہ ہائے اتفاق
ثمرۂ نااتفاقی جز ہزیمت کچھ نہیں[۳۱]

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہاں یہ محض بیانیہ نہیں بلکہ استعماری عقل ودانش کا نچوڑ بھی یہی تھا۔ نااتفاقی کے انجام کے علم کو انھوں نے 'لڑاؤاور حکومت کرو' کی صورت میں اپنی طاقت یوں بنایا کہ انھوں نے زندگی کے ہر اس پہلو، رویے، رشتے، پسندیدگی، تعلق، نظریات اور عقائد جہاں کہیں ہلکا سا رخنہ دکھایا ان میں کوئی درز پائی، وہیں تفرقے کا بیج بودیا اور پھر وہاں ایک خلیج بنتی چلی گئی۔

نوآبادیاتی عہد میں حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے گھڑے گئے مختلف بیانیے:

نوعِ انساں کو ملی ہے جب کہ عقلِ ناتمام — کچھ دنوں سے چڑھ رہے ہیں ہم بلندی کی طرف
اتفاق اور دوستی نے کر دیا ہے سب کو ایک — مملکت فوجوں اور قلعوں سے ہے معمور سب
پھر حماقت ہے کہ کیجیے آج، کل کا اہتمام — کر چکے ہیں قطع تھے یاں پُرخطر جتنے مقام
اور آزادی نے کر رکھا ہے ہر اک کو جدا — پایۂ نظم ونسق پہنچا ہے تا فوقُ السّما[۳۲]

یہ تمام بیانیے انسانی فکر اور دوراندیشی کو ضرب لگانے اور سوچ کی جڑیں کاٹنے والے ہیں، پرخطر ماضی سے نکل کر ترقی کی بلندیوں، اتفاق دوستی، آزادی اور ایک منظّم اور محفوظ ریاست میں جینے کو جس طرح ایک حقیقت کے طور پر اس نظم میں جتایا جارہا ہے، اس سے بیانیے کی طاقت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور مقامی باشندوں کی نفسیات کا بھی کہ جن پر ان بیانیوں کا ایک جادوئی اثر ہوتا ہے اور وہ ایک ہائپر رئیلٹی میں جیتے ہیں اور اس سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مٹھی بھر نوآبادکاروں نے پینتیس کروڑ لوگوں پر غیر متشدانہ طریقے سے جو غلبہ حاصل کیا تھا وہ انھی استعماری بیانیوں سے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

ہندوستان میں قحطوں کی وجہ سے ہلاک ہونے والے ساڑھے تین کروڑ افراد کی ہلاکت کو ششی تھرور نے نوآبادیاتی ہولوکاسٹ کہا ہے۔ اِس سفاکانہ ہولوکاسٹ پر نوآبادکار کا ظالمانہ، سفاکیت اور تکبر سے

بھرپور استدلالی بیانیہ، بیانیے کی طاقت اور افادیت کو مزید واضح کرتا ہے۔ اناج اور وسائل کے ہونے کے باوجود قوتِ خرید کی کمی سے ہونے والی کروڑوں ہندوستانیوں کی ہلاکتوں پر اس سے زیادہ سفاک استدلال انسانی تاریخ میں ممکن نہیں، درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

بارے ایسی ہند کی حالت نہیں زار و نزار — ہے موافق اس کی وسعت کے رعیت کا شمار
اس قدر بندوں کی روزی کا ہمیں کیوں فکر ہو — ہے خدا کے حکم پر سب کی معیشت کا مدار
کچھ نہیں تو قحط کا دورہ سلامت چاہیے — بڑھنے پائے گا نہ آدم زاد کا حد سے شمار
یاد رکھ اے منکرِ حق، ہے یقیں اصل نجات — وسوسوں سے اور کھل جاتی ہے راہِ مشکلات [۳۳]

اس بند کے مترجم حالؔی یہاں خود مزاحمت کرتے ہوئے حاشیے میں لکھتے ہیں:۔

"شاعر کے نزدیک غریب ہندوستانیوں کی جانیں خضرائے دمن اور حشرات الارض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جب قحط سالیوں میں لوگ بھوک سے مرتے رہیں گے تو مردم شماری بڑھنے نہ پائے گی اور ملک کی پیداوار ملک والوں کو کافی ہوگی۔۔۔ گویا بھوک سے مرنے کا علاج بھوک ہی سے مرنا بتاتا ہے۔" [۳۴]

نوآبادکار کے روس کے بارے میں کہے گئے درج ذیل اشعار دیکھیے:

ہے زبردستوں کا بول بالا آج کل — پودنے کی اصل کیا دیووں کا ہو جس جا خلل
دے گر انگلستان کی ساری رعیت مل کے ساتھ — تنگ ہو جائے عدو پر عرصۂ جنگ و جدل
ورنہ وہ ملت جو دو براعظم پر ہے آج — سایہ افگن صورتِ نخل تناور فی المثل
کیا تعجب ہے کہ اس کا سایۂ دور و دراز — رفتہ رفتہ جائے باہر اپنی سرحد سے نکل
سامنے اس قوم کے انگلینڈ کی ہے وہ مثال — جیسے اک بالشتا آجائے پیش مرد طویل
وقت پر سب مل کے گر اس کا نہ دیں گے ساتھ یاں — ایک طرف ہو جائے گا پلہ ترازو کا گراں [۳۵]

یعنی نوآبادکار اس وقت کی سپر پاور 'روس' کو طاقتور سمجھ بھی رہا ہے اور اس کے باوجود سب کی مدد سے اس پر حاوی ہونے اور اس سپر پاور کو ختم کرنے کا بیانیہ گھڑ رہا ہے۔ پھر اس سپر پاور کے قدم بڑھانے اور دنیا پر چھا جانے کے خدشے کے پیشِ نظر، اپنے بیانیے میں خوف کا عنصر بھی پیدا کر رہا ہے۔ یہی وہ بیانیے تھے جس سے ذہن سازی کر کے یورپ نے پہلی اور بعد ازاں دوسری عالمی جنگ میں اپنے استعماری مقاصد کے

لیے اپنی نوآبادیوں کے محکوم عوام کی زبردستی بھرتیاں کیں اور ان کو جنگ کا ایندھن بنایا۔ جن کے بارے میں ششی تھرور لکھتے ہیں:

> "پہلی عالمی جنگ میں ہندوستان سے سمندر پار خدمات کے لیے فوجیوں اور امدادی عملہ کی تعداد بہت زیادہ تھی: ان میں سے ۵۸۸۷۱۷ میسوپوٹامیا گئے، ۱۱۶۱۵۹ مصر، ۱۳۱۴۹۶ فرانس، ۴۶۹۳۶ مشرقی افریقہ، ۴۴۲۸ گیلی پولی، ۴۹۳۸ سیلونیکا، ۲۰۲۴۳ خلیج فارس گئے۔ ان ہندوستانیوں میں سے ۲۹۷۶۲ مارے گئے، ۵۹۲۹۶ زخمی ہوئے، ۳۲۸۹ لاپتہ، جنھیں مردہ تسلیم کر لیا گیا اور ۳۲۸۹ کو قید کیا گیا۔ کل ۱۲۱۵۳۱۸ فوجیوں کو ملک سے باہر بھیجا گیا ۱۰۱۴۳۹ مارے گئے۔"[۳۶]

اس پر ظلم یہ کہ جس وعدے پر یہ فوجیں بھیجی گئیں وہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا۔ برطانوی ایم پی ڈاکٹر راور فورڈ نے بیان کیا ہے:

> "دنیا کی تاریخ میں کبھی عظیم لوگوں کے ساتھ ایسے فریب کا ارتکاب نہیں کیا گیا جیسا کہ انگلینڈ نے ہندوستان کے ساتھ کیا، جب جنگ کے دوران ہندوستان کی بے بہا خدمت کے عوض، ہم نے ہندوستانی قوم کو ایسا ناقابلِ اعتبار، شرم ناک، غیر جمہوری اور غاصب آئین دیا۔"[۳۷]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے گھڑے گئے بیانیے:

جب بغاوت نے اُٹھایا سر تو اس سے بھی سوا — آگ بھڑکی مرگ کی اور خون کا دریا بہا
عورتیں اور ان کے بچے بے گنہ مارے گئے — گھر جلے اور دشمن جاں ہو گئے خود دست و پا
بھائی بندوں کی جفائیں دیکھ کر غمگیں ہوئے — اہلِ انگلستان کے ساتھی جو تھے اہلِ وفا
اور ہزاروں نے یہ باندھا مل کے منصوبہ کہ بسر — عزت انگلستان کی اب خاک میں دیجیے ملا
صفحۂ ہستی سے نام ان کا مٹانے کے لیے — ہو گیا تیار جان و دل سے ہر چھوٹا بڑا
لیکن اس کی گھات میں تھا شحنۂ قہر و غضب — پھنس گئے پنجے میں اس کے یک بیک اہلِ خطا
پلہ انگلستان کا ہو کر رہا آخر گراں — گرتے گرتے تھم گیا اقبال کا اس کے نشاں[۳۸]

یعنی یہ کہ ہندوستانیوں کی 'بغاوت' سے اہلِ انگلستان کے 'عورتیں اور بچے'، 'بے گناہ' مارے گئے

اہلِ انگلستان 'اپنے' بھائی بندوں' کی 'جفائیں' دیکھ کر غمگیں ہوئے۔ ہزاروں چھوٹے بڑوں نے 'انگلستاں کی عزت' خاک میں ملانے اور ان کو 'صفحۂ ہستی' سے مٹانے کا منصوبہ بنایا لیکن 'شحنۂ قہر و غضب' ان کی گھات میں تھا۔ اب یہاں 'شحنۂ قہر و غضب' سے مراد یہ کہ تائیدِ ایزدی ان کے ساتھ تھی اور اہلِ انگلستان کے ساتھ خطا کرنے والوں کو اس نے شکنجے میں کس لیا۔ ایک ایسا بیانیہ جس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ایسی قوم جو نہایت جاں فشانی سے اس ملک میں امن و امان قائم کرنے میں لگی تھی فتنوں کا سر کچلنے میں لگی تھی، اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ اس بیانیے سے مزید ہمدردی حاصل کرنے اور یہاں کے لوگوں کو ظالم ثابت کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو بے گناہ مارا گیا اور خود مارنے والوں کے وہ بھائی جو اہلِ انگلستان کے وفادار تھے وہ بھی غمگین ہوئے۔ ان لوگوں کو غمگین ثابت کرکے نوآبادکار خود پر کیے جانے والے ظلم کو ایک سند پہنچا رہا ہے لیکن پھر قہر و غضب کے منصب دار جو صرف خدا ہی کی ذات ہے، اس کا ایسے لوگوں کو شکنجے میں کسنا، مزید نوآبادکار کی مظلومیت اور مقامی باغیوں کے ظلم کے بیانیے کو تقویت دینے والا ہے۔

کمپنی کی حکومت کے بعد حکومتِ برطانیہ کے، ہندوستان کا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کے جواز کے لیے جو بیانیے گھڑے گئے ان میں یہ کہا گیا کہ دہلی کی فتح کے بعد بھی ہندوستان کی عوام غدر کے واقعات سے اتنی خوف زدہ تھی کہ:

چونک چونک اُٹھتے تھے بدخوابی سے لوگ — کر گئی دنیا سے گویا فارغ البالی سفر
صبح کے ہوتے ہی سب کافور ہو جاتی تھیں وہ — شکلیں ہیبت ناک جو راتوں کو آتی تھیں نظر
رائے یہ ٹھہری کہ پائے اب وہ قیصر کا لقب — تابع فرماں ہیں جس فرماں روا کے بحر و بر
قوتِ بازو سے جو حاصل کیا ہے قوم نے — وہ ہمایوں تاج رکھا جائے اس کے فرق پر
تاکہ سب جانیں کہ رخصت ہند سے فتنہ ہوا — عہدِ انگلستاں کا جو کچھ کہ تھا پورا ہوا [۳۹]

المختصر محض ایک انگریزی نظم کا تیسرا حصہ نوآبادکار کے بیانیوں کی ایک مکمل دستاویز فراہم کر رہا ہے اور یہ وہ بیانیے ہیں جن کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی طاقت سے استعمار کار پہلے مقامی لوگوں اور خصوصاً مسلمانوں کو ذہنی طور پر مغلوب کرتا، اُن کو نفسیاتی طور پر شکست خوردہ کرتا اور پھر اُن کی ہزیمت کے احساس کو اور ان کے قواء کو مزید سست رو زہر (Slow Poison) کا سا اثر رکھنے والے بیانیوں کی مدد

سے مضمحل کر دیتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مخصوص پیراڈائم میں بیانیوں کے سحر نے، مقامی استعمار زدوں کے اذہان کو کس طرح مسحور کر کے اکثریتی عوام کو ذہنی غلام بنایا ہوگا کہ جن کے اثرات جینز کے ذریعے آج اگلی نسل میں بھی منتقل ہو چکے ہیں۔ اس ساری صورتِ حال میں حالؔی کا کمال یہ ہے کہ وہ بیانیے کی طاقت اور اثر پذیری سے اس قدر آگاہ ہو چکے تھے کہ انھوں نے اس دستاویز کو عمومی زبان میں ڈھالا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حالؔی کا مقصد ان بیانیوں سے استعمار زدوں کی قلب ماہیت کرنا تھا یا پھر ان بیانیوں سے عوام کو آگاہی دینا تھا؟ تو اس کا جواب، اس نظم کے حاشیے میں دی گئیں حالؔی کی مزاحمتی وضاحتیں ہی کافی ہیں۔ یہاں حالؔی کا اپنی رائے کو 'حاشیے' میں رکھنا بھی نوآبادیاتی جبر کے اس عہد کے دانشوروں اور ادیبوں کی بے بسی لیکن جرات کو ظاہر کر رہا ہے کہ اگر ان کو مجبوراً نوآبادکار کے افکار و نظریات کا اجرا بھی کرنا پڑا تو وہ خود کو اور اپنی رائے کو اس سے الگ رکھتے ہوئے بھی ہر ممکن مزاحمت کر رہے تھے۔ اور حاشیے پہ رہ کر کیا جانے والا احتجاج ظلم کا جواب نہ بھی ہو، تب بھی مرکز کی بنیادوں کو مضبوط کرنے والے عوامل کی راہ میں ضرور آڑے آتا رہتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ایڈورڈ ڈبلیو سعید، شرق شناسی، مترجمہ: محمد عباس (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۵ء)، ۶۔

۲۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، مابعد جدیدیت ، اطلاقی جہات (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء)، ۲۴۱۔

۳۔ ناصر عباس نیر، ما بعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں (کراچی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء)، ۵۶۔

۴۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، مابعد جدیدیت ، اطلاقی جہات، ۳۱۴۔

۵۔ عاصم ثقلین درانی، کوئی روشنی مرا خواب کر (لاہور: نستعلیق مطبوعات، اردو بازار، ۲۰۰۷ء)، ۱۱۵۔

۶۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی، کلیاتِ حالیؔ، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶ء)، ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔

۷۔ ایضاً، ۱۰۶۲۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ایضاً، ۱۰۶۳۔ ۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ایضاً، ۱۰۶۶۔ ۱۲۔ ایضاً، ۱۰۶۷۔

۱۳۔ ایضاً۔ ۱۴۔ ایضاً، ۱۰۶۸۔

۱۵۔ ناصر عباس نیر، یہ قصہ کیا ہے معنی کا (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۲۲۔۲۳۔

۱۶۔ خواجہ الطاف حسین حالی، کلیاتِ حالیؔ، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی، ۱۰۶۹۔

۱۷۔ ایضاً، ۱۰۶۷۔

۱۸۔ ایضاً، ۱۰۷۰۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ایضاً، ۱۰۷۱۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ششی تھرور، عہدِ ظلمات، مترجمہ: عابد محمود (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ۱۴۴۔۱۴۵۔

۲۳۔ خواجہ الطاف حسین حالی، کلیاتِ حالیؔ، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی، ۱۰۷۲۔

۲۴۔ ایضاً، ۱۰۷۳۔ ۲۵۔ ایضاً۔

۲۶۔ ایضاً۔ ۲۷۔ ایضاً، ۱۰۷۶۔

۲۸۔ ایضاً، ۱۰۷۸۔ ۲۹۔ ایضاً، ۱۰۷۹۔

۳۰۔ ایضاً، ۱۰۸۰۔ ۳۱۔ ایضاً، ۱۰۸۲۔

۳۲۔ ایضاً، ۱۰۸۲۔ ۳۳۔ ایضاً، ۱۰۸۳۔

۳۴۔ ایضاً۔ ۳۵۔ ایضاً، ۱۰۸۰۔

۳۶۔ ششی تھرور، عہدِ ظلمات، مترجمہ: عابد محمود، ۱۱۹۔

۳۷۔ ایضاً، ۱۲۱۔

۳۸۔ خواجہ الطاف حسین حالی، کلیاتِ حالیؔ، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی، ۱۰۸۷۔

۳۹۔ ایضاً، ۱۰۸۸۔